

کہ لے تھے ز مجلس دُور ماندہ
 تو میدانی کہ از من نیست این کار
 گرت بندی ست از گیتی خداوند
 نمی شاید یریں اندیشہ تعجیل
 کنوں ما ہم دریاں ہنچار کاریم
 چو در خوردی کہ باشی مندارا
 دلے مہر کے کا ندر دولت رت
 دَولرانی کہ در پیشیت کینز ہست
 شنیدم کاں خیاں گشتا رحمت
 نہ بس نیبا بود کز چشم کونہا
 گدو در صحن بتاں کسیت بارے
 تمنائے دل مامی کند خو است
 چو زینجا رفت بازینجا فرستش
 چو سووائے دلتم گم گشت چیز
 اس پیغام کے جواب میں خضر خاں شاہی حکم کی تعمیل سے قطعاً انکار کرتا ہے
 درگتہا ہے
 پست آلودہ بچوں یا سخ بروں اُد
 تخت از دیدہ لب اجوش خوں اُد

کدشہ راتلک رانی چون فاکر
 ویرین دولت ہم ازمن و زخوی
 چوبامن ہمہرست این یار جانی
 دولرانی بمن بایدر ماکر
 مرابے دولت و بے نوزخوی
 سہرمن و درکن ز اں پس تو دانی
 اس سخت جواب کو نکر سلطان آگ بگولا ہو جاتا ہے اور ملک شادی کو طلب کر کے فوراً
 گوالیار جانے اور ان مظلوم اندھوں کے قتل کا حکم دیتا ہے۔
 ملک شادی نے ایک ات دن میں مسافت طے کی اور گوالیار پہنچ کر محافظان
 قلعہ کو شاہی حکم سے آگاہ کیا۔ بے باک سپاہی نہایت گستاخی کے ساتھ حرم میں داخل
 ہوئے۔ مستورات میں ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔ ناز پروردہ شہزادے مشکیں
 بندھے ہوئے قاتلوں کے سامنے حاضر کیے گئے۔ ملک شادی قتل کا اشارہ
 کرتا ہے لیکن اس لعنت انگیز کام کے انجام دینے کی کسی کو جرأت نہیں
 ہوتی ۵

چوبستناں و دولت مند سخت
 فتادنداں شکر فانی ز بونے
 چو خست آواز بے رحمی ز خنجر
 زمانہ بست دست دولت بخت
 درآمد سو بوشمشیر خونے
 درآمد خونے بے رحمت از د
 بہانے مایہ غم شادیش نام
 حسینے تہذیب اس سکین جبارو
 مخالفت چوں خطا مہر غم دام
 مخابے تیز چوں متین سنہارو
 ز شد برق کے در جہنم از مرغ
 اشارت کرد ہر سورا ندین تیغ

عفا اللہ برنیاں وہا ہے چون ماہ
 کرا اور دل نیاید سو زبانی
 فلک آباد یارب سینہ صدک
 بخوں قصاب ارحمت چو چوئی
 چو گل بند دبیر حلا و خونریز
 آخر کار ایک بیخ قوم کا ہند و جرات کر کے آگے بڑھتا ہے اور اپنے افسر سے جوہرا
 تلوار لے کر خضر خاں کو قتل کرتا ہے
 غرض کس پریشاں چوں نشدرا
 بجنید از میاں چوں تند باوے
 ز فرمانیدہ تیغ گوہرین جست
 برآمد گرداں سرد گرامی
 شہادت خاست از خضر اندر ان کاخ
 سیاست افلک اری ہی کرد
 در فردوس رضوان باز کردہ
 از ان مانگ شہادت نکاد از شاہ
 چو بزند خنجر شدہ جد برداشت ق
 سپری کرد خورشید از تن خویش
 کہے چوں بر کشد شمشیر کہیں خواہ
 ز افسوس چناں عمر جوانی
 کرنیاں از جہان اکند خاک
 کہ خواہد تیغ خود را سرخروئی
 ز اندام چو گل نہ بود بہر ہیز
 کہ گرد تیغ خون اکار فرماے
 فرد تر نسبتے ہند و نرثاے
 کشید کرد و امان قباحت
 کہ از سر سبزی خود بود نامی
 چو بیج درخت از سبزی شاخ
 شہادت ملک یاری ہی کرد
 ہمہ حوراں درود آفت از کردہ
 شہادت گوید شد ہم مہر ہم ماہ
 در آن منظر قعاں چوں عد برداشت
 دے تقدیر کیو کردش از پیش

کند تیغِ قضا چوں قطعِ مہتد
 نہ مہ داند سپر کردن نہ خورشید
 بیک ضربت کہ آن نامہ زبان کرد
 سیر شدہ در کنارش میمان کرد
 خضر خاں کی روح جسم سے نکل کر دو لرائی کے گرد اگر چپکے لگاتی ہے اور اپنی

الوداعی اسپر کرتی ہے

چون خونِ خضر خاں در خاک در شد
 زخونش ہر گیا خضرے و گردش
 بگردیدار خود می گشت جانش
 ہی گفت این حکایت از زبانش
 کہ اے جانِ من و آشوبِ جانم
 کہ در کار تو شد جان و جہانم
 چون بہرتنجاں کردم جدائی
 مبری زہشنا یاں آشنائی
 بہر جاے کہ خونِ انداں تین پاک
 گیا ہمہ خواہد رستن از خاک
 زخون و خاکم این رنگیں گیا جوے
 ازاں گوگردِ سخن این کھی جوے

ور آگہ میت آں ماہِ قصبِ پوش
 کہ خونم بر زمین چوں می کند جوش
 بخوانیدش کہ آید از سر سوز
 شہیدِ خویش ابلید بدیں روز
 بیارائید بریم بہمن و کے ملائد
 کہ من از خونِ خود خوش می خورم
 منم فرقِ سراں اگوہریں تاج
 کہ بر اوجِ سریرم بود معراج
 کنوں آں تاج خواہد با گل آمیخت
 کہ درشش گم شد و عیشِ فرودخت

گزشتیم از جهان و قاست ہوئے نماذ از ما بجا بس آرزوئے

نور و ہستیم شد ہیچ در مسیج ہنوزم قصہ دل ہیچ در ہیچ

غرض کہ حضرت خاں کے بعد اُس کے دونوں بھائی شادی اور شہاب الدین عمر بھی

تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور اس قیامت خیز حادثہ پر مستورات کی جو حالت

ہوئی اُس کو حضرت امیر اُس طرح پر بیان فرماتے ہیں ۷

شہابی کز سر پریش بود گری چشید او نیز ازاں جے آب خوری

چو شد خون شہیداں مشہد افروز برآمد شورِ ستوراں در آں سوز

کے کاوازشاں دیوار شنید ز بانگِ نعرہ شاں یوار پدید

ز پردہ ہوشاں بیروں نقادند چو فریادِ شفق درخوں نقادند

بچشمِ آب و برونوں ہمگناں را عجب خونابہ رو دادشاں را

ز چہرہ ہر بتے پر کالہ می کند ز روئے لالہ برگِ لالہ می کند

کناں ہر مئے کہ بردہاے نوید شبِ غم را دید پیوند جاوید

ز مویئے کندہ و خونِ روانہ ز خون و مشکِ پر شد صحنِ خانہ

جہاں در دیدہ مادر شدہ تار کہ از چشمش دو مردم رفتہ یک بار

ہوس بہر ہلاکِ خویش سے برد
ہمی مرد از پئے مرگ و نئی مرد
فتادہ نعبتاں چوں خاکِ برد
بجائے گلِ فگندہ خاکِ بر سر
فرشتہ گر یہ ہمچوں ابر میگرد
ببالا بردنِ جاں صبر میگرد
ہمی کرد این ندا ہاتفِ زبالا
سَلَامٌ جَاءَ مِنْ رَبِّي تَعَالَى

اس ماتم میں دولرانی کی جو حالت تھی اُس کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو

دولرانی در آن خوتابہ سرگم ق چوماہ چار دہ در جمعِ انجم
ز تابِ مہر و صفرای و تاپاک چوتابِ مہری افتاد بر خاک
ز زخمِ ماہِ نو و سر کنارہ بصد پارہ کُتھے چوں ماہ پارہ
نہ زان رخسارہ می شد پارہ دو کہ از مرد و رمی شد پارہ نور
صباحت ہم بر آن رخسارِ گلگون ہی کرد از جراحتِ گریہ خوں
ز چشم و رخ کہ خوں بیروں ہمیرفت بہر سویلہاسے خوں ہمیرفت
ز کوبشِ بر رخِ پر خون و رنگیں خامی بست بر دستِ نگاریں
بساعت موہیائے پیچ کردہ چوما راں گردِ صندل پیچ خوردہ
بیادِ پیچِ موٹے کہ خاں داد بہ پیچِ موہی خواست جاں داد

دراں موہا کہ پیچ بے کراں بڑ
دلِ خانِ حُبتِ جانِش ہمدراں بڑ

جب اس قیامت خیز ماتم سے کچھ افاقہ ہوا تو شہیدوں کا جتنا زہ اٹھایا گیا

اور قلعہ گوالیار کے ایک برج میں جس کا نام بچیند رہے اُن کی لاشیں بصدِ حشر

پس دفن کی گئیں

چو شد ہنگام آں کاں کشتہ چنید ق بزندان ابدمانت در بند

شہیداں رازِ مشہد گاہِ فونریر
رواں کردند سو سے خواہ گہ تیز

بچیند رکڑجے زانِ حصار ت
شماں راکاندر اں جاعے قرارت

در آن بو دشماں ریزاں ز چشم آب
کہ خپند اندراں شماں خوش خواب

بنگیں محبہ در فرجہ تنگ
نہاں کرد دشماں چوں لعل تنگ

بچشم ہری کے خوابِ عدم بود
ولیکن خونِ شماں را خواب کم بود

نگر کاں خوں کہ خوابش رفت ز ہید
کیاں را خوست و ادن خواب جاوید

یہاں پہنچ کر حضرت امیر خسرو قصہ کے واقعات کو اس اندوہ ناک حادثہ پر ختم

کر دیتے ہیں اور اپنے ناظرین کو عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے متنبہ فرماتے

ہیں۔ میں بھی اپنی ناچیز گزارش کو جو بہت کچھ تصدیق کا باعث ہوئی ہوگی اس

مقامِ پختہ کرتا ہوں۔ لیکن ختم سے پہلے کچھ لفظ عرض کرنے ضروری ہیں۔
 اس میں شبہ نہیں کہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ ایک اہل دل پاک باطن روشن ضمیر
 صوفی صافی تھے۔ انھوں نے آخر کے دونوں شعروں میں جو پیش گوئی کی تھی
 تاریخ شاہد ہے کہ وہ کس قدر حیرت انگیز طریقہ کے ساتھ پوری ہوئی۔ کم و بیش
 دو سال کے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ اور اُس کے خاندان پر خسرو
 خاں کے ہاتھوں سے جو تباہی آئی اُس کے بیان سے قلم تھراتا ہے۔ قاتلوں نے
 سلطان کا کام تمام کر کے شاہی حرم میں یورش کی چاروں شہزادے اور
 بعض بیگمات زوج کر دی گئیں۔ کچھ مستورات اور شہزادیاں سپاہیوں کو
 بخش دی گئیں اور وہ کچھ کیا جس کا بیان ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس
 خاندان کا نام صفوحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا اور اہل عالم کے لئے
 ایک نمونہ عبرت بنا دیا گیا۔

فَسُبْحَانَ اللَّهِ مُغَيِّرِ الدُّوَلِ وَمُبَيِّنِ الْأُمَمِ وَالْمَلَلِ الَّذِي
 هُوَ قَوْلُ فِي كِتَابِهِ الْحَكِيمِ "وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِشَتَهَا فَتَكَ مَسَاكِنَهُمْ
 لَمْ تَكُنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ"

مثنوی کی خصوصیات | فارسی شعر نے مخلص یا گریز کو صرف قصائد کے ساتھ مخصوص رکھا ہے اور دیگر اصناف کلام میں اُس کو استعمال نہیں کرتے۔ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا کہ کسی شاعر نے مثنوی میں گریز کا استعمال کیا ہو۔ مگر حضرت امیر خسرو نے اس مثنوی میں گریز لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

سلطان علاء الدین کی ان عظیم اہم شان فتوحات کو جو اُس کے جہزوں نے
گجرات، رنتھورا، چتورا، ماندو، سمانہ، تلنگانہ، معبر، مرہٹ اور پوری میں حاصل
کیں اُن کو یوں بیان کر کے لکھتے ہیں ۷

تعالی اللہ کرا باشد چہیں بخت	کہ گیرد عالمے بے جنبش از بخت
بدہی او کند ز ابر و اشارت	قد در معبر و بحرین غارت
عزیمت نے و در ملک سلیمان	ہند دیوان ہندش زیر فرمان
سکندر خود سفر کردی در اطراف	بحر و تیغ زان زد قاف تا قاف
نہ بستہ از جنبش ترکش خویش	شدہ تیرش درون عرصہ کیش
چناں بودند دیگر خسرواں ہم	کہ چہ جنبش نشدند ملکہ مسلم
چناں خورشید کو ہست آسماں گیر	سفر خود میکند زان شد جہانگیر
بہ از خورشید اداں ایں کامراں ا	کہ بے جنبیہ نی گیرد جہاں را

پھر فرماتے ہیں کہ یہ بلند مرتبہ اور یہ اعلیٰ پایہ کون حاصل کر سکتا ہے سولے اُس کے فرزند
ارجنہ شمس الحق خضر خاں کے جس کا جاہ و جلال اور دولت و اقبال رو بہ ترقی ہے

مگر باوجود اپنی اس اقبال مندی کے اپنے دل کے ہاتھ سے مجبور ہے۔ نہ دن میں اُس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہوتے ہیں اور نہ رات کو بستر خواب پر نیند آتی ہے۔

بدریں گو نہ کہ یابد پایہ بالا	مگر ہم زادہ اوٹمس والا
چو بخت خود جوان و پیر تدبیر	چو نام خویش خورشید جب نگیر
ہنوزش تیغ فتح اندر نہفتہ است	ہنوزش یک گل از صد ناشگفتہ است
ہنوزش تیغ نصرت در نیام است	ہنوزش تافہ امید خام است
ہنوز اندر طلوع ست آفتابش	ہنوز اندر بر افروزی ست آیش
ہنوز اقبالش اندر کار سازیت	ہنوزش نخل تر در سر فرازیت
ہنوزش میرسد بر گل صبا ہا	ہنوزش چرخ میدوزد قبا ہا
زمانے باش تا بکشاید این دُرج	توق بالا کشد خورشید از برج
جمال کارِ آں بختِ جہانگیر	بروں آید شاد روانِ تقدیر
شود روشن کہ این مہ بر زمین است	حد این آفتاب ملک و دست
بدور مہ شود بدر سے ہلالش	کہ امین باشد از نقصان کاش
غلط کردم کہ گرد آفتابے	کہ کم بنید زوال و انقلابے
ولے با این وجود مقبلِ خویش	گرفتارست در دستِ دلِ خویش
نہ روزش خشک گدوزیر چشم است	نہ شب پہلوزند بر بستر خواب
ہمیشہ با خیالِ غمزہ در گفت	معیلاں زیر پہلو چوں توانِ خفت

اس مثنوی میں حضرت امیر خسرو نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر ایک استان کے
 آخر میں دو غزلیں لکھے ہیں۔ اول "غزل از زبان عاشق" اور دوم "پاسخ از لب معشوق"
 ان غزلوں میں وہ عاشق و معشوق کی زبان سے انھیں جذبات اور خیالات کو ادا
 کرتے ہیں جو اس استان کی مناسبت سے ان کے دل میں ہونے چاہئیں۔ یہ غزلیں
 اگرچہ مثنوی کی بحر اور مثنوی ہی کے انداز میں لکھی گئی ہیں اور اصطلاحی طور پر ان کو
 غزل نہیں کہا جاسکتا لیکن ان میں سوز و گداز رقت اور درد کی وہی کیفیت پائی جاتی
 ہے جو حضرت امیر خسرو کے تغزل کا عام انداز ہے۔ یہ غزلیں جن کو صرف لغوی معنیوں
 کے اعتبار سے غزل کہا جاسکتا ہے شاید ناظرین کو اجنبی معلوم ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ طریقہ
 قدما میں عام تھا مگر ان کے یہاں اس قسم کی غزلوں کا نام غزل نہیں ہوتا بلکہ ان کو سرود
 کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فخر الدین سعد فخری جرجانی نے اپنی مشہور مثنوی ویس و
 بیہ میں متعدد مقامات پر عاشق کی طرف سے سرود لکھے ہیں۔ خواجہ نظامی گنجوی نے
 شیریں خسرو میں یہ تمام سرود ایک ہی مقام پر جمع کر دئے ہیں۔ مولانا عصار شیرازی
 نے اپنی مثنوی مہر و مشتری میں جو بہت کمیا ب ہر کسی مقام پر سرود نہیں
 لکھا۔ البتہ خاتمہ کے قریب ایک غزل لکھی ہے جو مثنوی کی بحر میں ہے اور لغوی اصطلاحی
 ہر اعتبار سے غزل ہے۔ چونکہ یہ غزل اس زمانہ میں بہت کچھ حسب حال ہے اس لئے
 ناظرین کی دلچسپی کی غرض سے اس کو نقل کرتا ہوں۔

جو عصار مہر از طبع مردم کہ گل ہرگز بشورستان نیند

وفا از صورت بے معنی خلق چو از صورت ملائک میگزیزد
 بغربال فلک بر فرق اینها قضا جز گرو خداری نہ بیزد
 بہر آن را کہ نیکی بیش خواہی بکینت ہرزماں بدتر ستیزد
 چو اشک آن را کہ سازی جاوچشم اگر دستش دہد خونت بریزد

خواجے کرمانی نے ہمائے و ہمایوں میں غزل اور سرود دونوں چیزیں لکھی ہیں ان کی غزل تو ہر لحاظ سے غزل ہی جو مثنوی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ لیکن سرود لہجہ مثنوی ہی۔ خود امیر خسرو نے قران السعدین میں متعدد غزلیں لکھی ہیں جو واقعی غزلیں ہیں ان کی بحر میں بھی جدا جدا اور مثنوی کی بحر سے مختلف ہیں۔

میر مقصد اصلی اس طویل داستان کے لکھنے سے یہ ہے کہ مثنوی کے ساتھ غزل یا سرود کا لکھنا کوئی اجنبی اور غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ فارسی شعرا میں معمول رہا ہے۔ حضرت امیر خسرو نے اس میں صرف اس قدر ترمیم کی ہے کہ ان کو غزل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ہر داستان کے خاتمہ پر لکھا ہے۔

ایک داستانِ فراق کے خاتمہ میں عاشق و معشوق کی زبان سے جو غزلیں لکھی ہیں ان کے اشعار نمونہ کے طور پر ہم درج کرتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہے جہاں خضر خاں اور دولرانی جدا کروئے گئے ہیں اور دولرانی کو قصر لعل میں بھیجا یا ہے۔

غزل از زبان عاشق

جمال صحبت یارانِ دلجو سے غنیمتِ دشت باید از ہرے سے

کہ گردوں گر چہ چشم آمد سراپائے
 ز شمشیرے کہ بر بالاکشیدہ است
 کجا دو غنچہ باہسم کردیوںے
 چہ بینی رستہ دو گل بریکے شاخ
 بیک رشتہ شود صد دروہم
 نمیدانم کہ دورانِ دغا باز
 دراں بُرجی کہ آن مرشد حصاری
 ز دم مجھے ز چشم خون چکپیدہ
 بگولے بادکت آتش نعل است
 بقصر لعل آن دخواہ چون است
 کجائی لے چراغ دیدہ من ق
 بار عیش من گر شد خستہ نانی
 دو مردم دیدنتواند بیک جا
 بسا پیوند ہا کہ ہم بریدہ است
 کہ ہر یک را خزاں نفلند سوسے
 کہ ہر یک جانے رنگیں کند کاخ
 ولے در رشتہ کے مانند ہام
 چرا پیوند دو بزد تہسم باز
 سپردم دو ددل را پر وہ داری
 کہ قصرش لعل گشت از خون دیدہ
 رہت کہ بر آں گلہائے لعل است
 شفق چون ست درے ماہ چون است
 رخ خوب تو باغ دیدہ من
 ترا ہر روز با داتو جوانی

پاسخ از لبِ معشوق

بیالے نوشداروںے دلِ من
 ہر آنچہ از مہر تو آمد برویم
 من و شہاسے ہمچوں کوہِ دریش
 پس دیوارِ غم - غمخوار ماندہ
 ز تو صد تلخی غمِ حالِ من
 نیار دتاب اگر بز کوہ گویم
 فرقی با ہزار اندوہ در پیش
 تنے چوں صورتِ دیوار ماندہ

زسوزِ دل چو غم برزند جوش
 و لیکن چوں توئی پیوستہ باتوں
 چوتنگ آیم ز شہاے یہ روز
 ندانم از تو ایسِ بیخِ ابد را
 ز غم بر حالِ خود خندم نہ بر تو
 دعا ہا کز پیت جاں کردہ تلقین
 ز چشمِ خویش سحر آموزم آن گاہ
 نیازِ خویش بنیم چوں ز حدِ بیش
 گر آمد آفتابِ من بزردی
 مرا گردونِ سبز ادا و ابر باد
 ترا خوانم کس نمکِ افراموش
 با ساں چوں بوی از سینہ بیرون
 بر آرم از جگر آہے جہاں سُو
 دعائے بد کتم شبِ او خود را
 گنہ بر بختِ خود بندم نہ بر تو
 ہمہ شب گویم و دل گوید آمین
 فسونِ صبرِ خوانم گاہ و بیگاہ
 دعا سوت دمِ افسوں کو خویش
 چہ چارہ با سپہرِ لا جوردی
 خضر خاں را بسر سبزی بقا باد

ایک بیماریہ تمہید | مثلاً خضر خاں کی پہلی شادی کی داستان حسب ذیل ہے:

تمہید سے شروع کی گئی ہے

چو گل در جلوہ ناز آمد از شاخ
 ہولے شد چو آغسازِ جوانی
 نسیمِ صبح چوں مشاطہ پر کار
 بسرخ و سبز نور و ز طرب نئے
 بروے باغِ بارانِ بہاری
 کشاد از گوشہ نرگسِ چشم گشاخ
 مژاوارِ نشاط و کامرانی
 بز یور بستنِ خوبانِ گلزار
 عروسانِ حمن را پیکر آراے
 بدورِ پاشی و مروارید باری

بہارا زلالہ و سوری بگلشن
 زرنگ سبز و تر شاخ نگوں مر
 بصد گلگونہ باغ آراستہ روے
 خراماں در چمن خوبان سقلاب
 ز عشق پیے خوباں ز گس مست
 ہی کو سوے بتاں رے کردہ
 ز غمچہ بیکہ بکشاوہ دم مشک
 بنغمہ بیل و قمری خسرو شاں
 ز مرغانی کہ گشتہ ارغنون زراے
 کشاوہ چشماسے بستہ را آب
 ندادہ چشم خود را بر زمین لپت
 میان چشم ز گس جے کردہ
 شدہ از مئے ترچوں ناؤ خشک
 سر فلکن گشتہ ہر سو سبز پوشاں
 نئے آمد صبارا بر زمین پائے

شاندار تمہیدیں | اس مثنوی میں ہر ایک دستاں کا بیان ایک نیا
 شاندار اور مبسوط تمہید کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے اس دستاں کے
 لئے مناسب اور موزوں ہوتی ہے۔

مثلاً سلطان علاء الدین کی ناراضی اور خضر خاں کے تنزل کی

دستاں کو اس تمہید کے ساتھ شروع کرتے ہیں ۵

بے دیدم دیریں گردنہ دو لا
 اگر خورشید ایں ساعت بلندست
 ندیدم ہیچ دورش زریکے آب
 زمان دیگر از پستی تر شدست
 دگر تیار گاہ ہم زیں شمازند
 کہ کہ ز پروگے بالا بکار نہ

چو ایں گردش ہمہ بالا وزیرت
گر آید زیر بالائے نہ دیرت
مکن تکیہ بصدرو مسند تخت
خسست ایں جملہ چوں بادوزد سخت
ز تاراج سپہ دویں بندیش
کہ صد شہ را کند یک لخط درویش
بچشم خویش دیدم کجکلاہاں
برہنہ پاؤ کفش کنہ خواہاں
گوش خود شنیدم تاجداراں
نبے نانی بخوشہ جو شماراں
عملہائے جہاں برعکس ہم بہت
کہ بر ملک گئے را دہ دست
چنین ہم دیدہ ام کافر وہ پائے
بہ تخت زرد دیدہ پائے

اس تمہید میں دنیا کی بے ثباتی اور عالم کی ناپائنداری کا خیال ایک نہایت لطیف تمثیل میں ادا کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ آسماں جس کی گردش دولابی ہے کبھی ایک حالت قرار نہیں پکڑتا چاند سورج اور ستارے کبھی اوپر مصروف کار رہتے ہیں اور کبھی نیچے پس جبکہ یہ دولابی گردش بلندی اور پستی میں مسلسل جاری رہنے والی ہے تو اگر بلند مرتبہ لوگ پستی میں آجائیں اور پست مرتبہ عالی قدر بن جائیں تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ اس نفس تشبیہ میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ دولاب میں پانی کے بھرے ہوئے ظروف اوپر آجاتے اور خالی ہو کر نیچے چلے جاتے ہیں اور یہی دور و قریب مسلسل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

اور کسی عجمی شاعر نے اسی مضمون کو اس طور پر کہا ہے اور فی الحقیقہ اچھا کہا ہے۔

کوزہ دولاب را ماتہمی
ہر کہ زیر چرخ دولابی بود
کز پس اوج و بلندی حاش
سز گونہ ساری بے آبی بود

ذوق کے اتنا و شاہ نصیر دہلوی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے

بندی پر چڑھا کر خلق کو پھینکے ہرستی میں

بند و لایے سب تھکوں نہیں اے آسمان بڑھا

خضر خاں کا قتل | اگرچہ اس مثنوی کی تمہیدیں عموماً بلند اور پُر شکوہ ہیں لیکن

سلطان علاء الدین کی وفات اور خضر خاں کے قتل کی داستان میں حضرت امیر خسرو

نے خاص طور پر اس کا لحاظ رکھا ہے اور واقعات کی اہمیت کے لحاظ سے ان کی تمہیدوں

کو اس درجہ عبرتناک، موثر اور پُر سحر بنا دیا ہے جو شاعری کا کھلا ہوا معجزہ ہے جس پر ایک

منکر کو ایمان لانا اور حضرت امیر کا کلمہ بھرنے فرض ہو جاتا ہے۔ اول الذکر تمہید کے چند

اشعار ہم یہاں ثبت کرتے ہیں ۵

بصرت میں ہیں پرِ ذرہ گلشن

برنگ و بونے چوں طفلانِ مشو شاو

چنیں گھنا بے کردہ ہست خاشاک

کہ از یک صدمہ فے بر زمین خفت

کہ شد پست از خزاں را باد بر خاست

دریں نزم بتگ آمد چشمِ بنیش

خرا مید اندرین صحرا بشاوی

نگہ کن تا بیابانے کیاں تافت

گرت در بند چشمے ہست روشن

ازیں گھنا کہ بینی گلشن آباد

کہ باد تند ایں خاکِ خطرناک

نگر تا چند گلبن تازہ بشگفت

نگر تا چند سرو آزاد بر خاست

نگہ کن تا کیاں راز آفرینش

نگر تا چند خوش کی قبادی

مہرے کز میں بجز آشیان تافت

نیسے کان وزد ہر صبح گاہے
 خیالے را کہ نقشے بر زلال است
 دریں بیرانہ عقل آں را پسند
 دریں ایوان کہ بینی لعبتے چند
 کہ لعبت با زبایں ہر مہفت پر وہ
 ہر آں لعبت کت امر و زآورد پیش
 میں لعبت کہ برٹے زمین است
 گراز دیباے چیں خواہی نمونہ
 چرا بر تختِ عاج آئکس ہند تاج
 خرد بیند چو گرد و استخوان سنج
 میں کام روزماندش استخوان چیز
 چو اول خاک و آخر نیز خاکیم
 چو ہر کہ از خاک زاید باز خلکت
 چرا باید گرفت آں کشور و شہر
 نگرتا بر چہ گلہا و اہنت رہے
 امید ویر پاستن مجال است
 کہ درے رخت بند و دل نہ بند
 بزلف و بعد شاں دل اکمن بند
 کہ لعبت می کشد ہر مہفت کردہ
 چہ خواہد کردنش فردا بندیش
 کہ زیر خاک لعبت میں ازین است
 زمین را کرد باید با شگونہ
 کہ زیر تختہ نگل خواست شعلج
 کہ شاہ را میں شد شاہ شطرنج
 کہ فودا خاک گرد و استخوان نیز
 پند چندیں بر خاکے سینہ چاکیم
 خوش آئکس کہ غم ہیوہ پاک است
 کزاں نہ ہند میں از چار گزہر

خضر خاں کے قتل کا واقعہ ایک خاص قسم کا واقعہ ہے۔ خضر خاں کی نوعمری، نوجوانی
 اُس کا حسن و جمال اور ناز و نسیم اور اُس کی عام محبوبیت جو تمام اہل ملک کے دلوں میں جاگزیں
 تھی اُس کو بیان کرنے کے بعد اب حضرت امیر خسرو اُس کے قتل کی داستان لکھنے پر

مجبور ہوتے ہیں بظاہر ہے کہ ان حالات میں ایسے رقت خیز واقعہ کا لکھنا اور پڑھنا کوئی آسان کام نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے دل کانپ اٹھیں گے۔ جگر چاک چاک ہو جائیں گے اور دامن صبر و شکیبائی پارہ پارہ ہو جائے گا اور سخت سے سخت طبیعتیں بھی اُس کو مشکل ہی سے برداشت کر سکیں گی۔ اس لئے وہ تہید کے ذریعہ سے اس عبرت خیز منظر کے دیکھنے کے لئے اپنے ناظرین کو تیار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ۵

بہر عاشق چنیں آہے دریغ مست	شرابِ عشقبازاں آبِ تیغ مست
بزمِ خم تیر باراں کے نندروے	کے کز زخم بارانش قدموںے
کزاں بارانِ خوں خندید چون برق	بساعاشق کیش آمازہ برفرق
سروشِ خوں گرید و لبہاش خندہاں	بفرقِ مردچوں راندازہ دندان
نہ از شمشیرِ بیم آید نہ از تیر	چو مہرِ دوست دلِ راشدِ عشاں گیر
خبر کے باشد ارخچر گزارند	جمال و شوق تا در دل بکارند
زناں را دست شویمانید از خوں	شعیدی قصہ یوسف کہ تاچوں
ترنجش بر کف و کف پارہ کردہ	زناں کاں حُسن را نظارہ کردہ
جنابِ دوست خود زینگونہ بندند	۶ و سائے کہ حُسنِ شہ پسندند
چہن مست ہیں کہ ہر سو می فشانم	چہ داغِ نست ہیں کہ ہر جامی نشانم
کہ رونے سوختہ باشد بدیں روز	کے روشن کسند ہیں آتش سوز

نہ ہر دل داندائیں داغِ نہاں را نہ ہر کس پے فتدائیں سوزِ جاں را
 کسے کو سر نہد در پائے خوباں سرش بگریزد از تن پائے کو باں
 چو مرغے شد بہ مہمانی ہوسناک ز خونِ خود دہد مہمانی خاک
 حضرت امیر خسرو صرف اس متیہ ہی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ آگے چل کر ایک عارف
 شاہ پرست کی حکایت لکھتے ہیں جس کی شہادت کے لئے معشوق کا ایک تیرنگاہ ہی
 کافی ہو گیا تھا اور پھر اُس کے بعد بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں ۛ

چو بر عاشق اشارت تیغِ خویش سیاست کردن از رحمت بہوش
 خضر خانے کہ چوں وحشِ شکاری ز غمزدہ داشت برجاں زخمِ کاری
 چہ حاجت بود چرخِ بے وفارا بروراندن زخوں تیغِ جفارا
 ولیکن چوں چنانش بود تفتد گستن کے تو اند بستہ زنجیر
 اور داستان کے خاتمہ پر اس پر عبرت واقعہ کو مقدرات اور مشیت ایزدی پر حوالہ کیے
 ایک معمولی اور بے حقیقت واقعہ بنا دیتے ہیں ۛ

زبے خونابہ مردم کہ گردوں ز شیرش پروردانگہ خوردوں
 نگرتا چند گرد و دورا فلک کہ یک نوبادہ بیروں آرد از خاک
 کسے کو کرد کا سے بہ خوردن شکستن بہت آساں ترز کردن
 کسے تیمار دارو زیں کم و کاست کہ نتواند از انساں دیگر آراست
 چو پیش ساخت چوں شکستن آساں ز بیش و کم کجا باشد ہر آساں

چہ باشہ خضر خاں بل صد خضر نیز
 ازیں خضر اے رنگیں گشت ناچیز
 پس اں بہ کاومی درجاں سپردن
 بقاے خضر یا بد بعد مردن

فلسفہ شعر بعض اوقات شاعر اپنے غلط یا صحیح دعاوی کو شاعرانہ دلائل سے ثابت کرتا ہے فلسفہ شعر سے میری یہی مراد ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس فلسفہ کی بنیاد ہمیشہ واقعیت پر ہو۔ بلکہ شاعر تشبیہوں اور تمثیلوں کی طرف لگی اور حسن بیان سے اپنے سامعین کو اس قدر مسحور کر دیتا ہے کہ سولے تسلیم کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ اس قسم کے فلسفہ سے اگرچہ کسی شاعر کا کلام خالی نہیں ہے۔ لیکن حضرت امیر خسرو اس مضمون کو تفہیم کے سلسلے میں جا بجا کثرت کے ساتھ لکھتے ہیں اور نہایت خوب لکھتے ہیں۔ میرے نزدیک اس صنف کلام میں اُن کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ قدما اور متوسطین میں سولے خواجہ نظامی اور شیخ سعدی کے کوئی شاعر ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ چند مثالیں اس مثنوی میں سے پیش کرتا ہوں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

فطرت اور خلقت کی تبدیل ناممکن ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ اور اگر کہیں اس کے خلاف نظر آئے تو اُس کو عارضی سمجھنا چاہیے۔

زر روزی خواہ در وہ خواہ در نہ
 مقام ہر کسے پیدا است در وہ
 پزندہ بال و پر بہر ہوا یافت
 خزندہ از زمیں ہون نو یافت
 بچید موش با لا بر نیاید
 مگر آن کس عشیہ ازے کویاید
 عقاب از وجہ توان شدن بست
 مگر در باز و ش لنگر توان بست

بھیلہ چند باشد پست را اوج بدریا بر شود۔ باز اوقت موج
بنِ چو رازیک گزنگز و شاخ شود گر جو بچو تا ابرگ ستخ

اقبال منداور ہوتا اونچے گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں ۵

سعادتہا ست اندر پردہ غیب نگہ کن تا کر اریزند و جیب
سُرے کو خواست شد تاجِ جہانی تولد یا بد از صاحبِ انی
دُے کز روشنی گرد و جہا میگر شو دپید از ابر آ سما میگر
زبردزادہ کوہِ بلند ست کز انساں در بندی ارجند ست
شعاعِ مہر گیر اتر ز مہر ست کہ ایں آفاق گیر آں در پہر ست

ابراور کوہ دونوں لفظوں میں بلندی کا خیال موجود ہے لیکن کوہ کے ساتھ آسمانگیر کی صفت بڑھا کر استدلال میں زور زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ سورج آسمان میں ہے مگر شعاعیں تمام عالم کو مسخر کئے ہوئے ہیں۔ اور اس صفت میں وہ سورج سے فائق ہیں۔ اس شعر میں مضمون زیادہ صفائی کے ساتھ ادا نہیں ہوا۔ اسی قسم کا ایک دوسرا مضمون ثابت کرتے ہیں ۵

شہزادی کش بود ز اقبال بونے رسد در گوہریں جام از بونے
گلی کو خواست الاد شکہ نیت نیار دسویں دیگردست رہ نیت
دُے کو خواست شد بر افسرِ خاں رسد در گنج شد از دستِ خواں

حقیقی محبت کا اظہار دُوری کی حالت میں ہوتا ہے ۵

ہم کہ کس پیش رو باشد خسیار
بدوری دوستی گردد پدیدار
نیاری خس کشتی باشد کہ گہ گاہ
تزدیکی رُباید کس ربا۔ گاہ
کم از ذرہ نشاید بود کز خاک
دو دمر گشتے سے مہرِ افلاک
بہ نیلو فرنگ کز مسر جاوید
فر و میرد چو پناں گشت خورشید
وفاداری زماہی باید آموخت
کہ گراز آب یکدم شد جدِ خوشت

نیلوفر کا پھول دن بھر کھلا رہتا ہے اور غروب آفتاب کے بعد مڑ جاتا ہے۔
بزرگوں کا توکل موجب حصول عزت ہوتا ہے۔

چہ نیک اختر کے کز بخت فیروز
شوہ پیش بزرگاں خدمت آموز
چو خاک تیرہ گیرد دامن باد
نماند ابر را زود امن آزاد
چو پیش با چار آفت کہ ورا
چار از خویش برتر دارد اورا

آسمانی مصائب پر رضا و تسلیم اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ اکثر اوقات وہی مصائب
جن کو انسان ناپسند کرتا ہے اُس کی ترقی و کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

چونے امید پائندہ است و نیم
خوش آنکس کونند گردن تسلیم
چون توں بر شستہ کردن گستن
باید دل در و ناچار بستن
بس آفت کاں نوید کامرانیست
بناغم کاں کلید شادانیست
چہ دانہ طوطی کا فادہ در دام
کہ از شکر دہندش طعم در کام
چہ دانہ باز چوں بندند پایش
کہ دست شاہ خواہد بود جایش

ساہنہ و کہ گریہ در اسیری کند شکر اسیری در اسیری
 آخری شعر میں حضرت امیر خسرو نے چشم دید واقعہ نقل کیا ہے۔ یعنی ملک کافر، سلطان
 علاء الدین کے عہد سلطنت میں ان کے سامنے غلام بن کر آیا اور ترکار وزارت
 اور نیابت سلطنت کے منصب پر پہنچا۔

عشق میں امارت و سلطنت کو کوئی نہیں پوچھتا

بکار عشق شاہی برنگیرد بغم صاحب کلاہی برنگیرد
 چو از بلقیس حسد باد بیداد بے سخت سلیمان را برد باد
 بخوں قصاب راجت چہ جونی کہ خواہد تیغ خود را سرخروئی
 چو گل بند و بسر جلا د خوزیر ز اندامے چو گل بنو دب سپہر
 عمل گر بہرہ اندک در فزون داد بامیدے دن ست آدمی زاد

واقعہ نگاری حضرت امیر خسرو کی شاعری کی ایک ممتاز صفت واقعہ نگاری ہے
 واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ شاعر جس اصلی یا فرضی واقعہ کو بیان کرنا چاہے اس کے
 تمام جزئیات اور متعلقات اور لوازمات کو ذکر کر کے واقعہ کی تصویر بنو بنو کھینچ دے
 اگر وہ واقعہ فرضی بھی ہو اصلی اور واقعی معلوم ہونے لگے۔ قدامت کی شاعری کا طغراء
 امتیاز یہی صفت رہی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ متاخرین نے اس سے غفلت کی اور ان کی
 شاعری میں یہ ضروری صفت بہت ہی کمیاب ہو گئی ہے۔

حضرت امیر نے اس مثنوی میں متعدد تاریخی واقعات لکھے ہیں اور اس خوبی کے

ساتھ لکھے ہیں کہ کوئی خوش بیان مؤرخ بھی اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مؤرخین جب سلطان علاء الدین کے عہد سلطنت کے واقعات لکھا چاہتے ہیں تو بجائے اپنے الفاظ اور اپنی عبارت میں لکھنے کے اس مثنوی کے اشعار نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور راجہ درگا پرشاد نے اپنی تواریخ میں جیسا ایسا ہی کیا ہے اور اس مثنوی کے صفحے کے صفحے نقل کر دئے ہیں۔ محمد قاسم فرشتہ جو ایک مستند مؤرخ ہے کہیں کہیں حضرت امیر کے بیان سے اپنی تاریخ کے صفحات کو زینت دیتا ہے۔ اور یہ کسی شاعر کے لئے انتہاء خوبی ہو سکتی ہے کہ اس کا بیان محتاط مؤرخین کے نزدیک بھی قابل استناد ہو۔ جو اشعار ہم اوپر نقل کر آئے ہیں ان میں سے نمونے اعلیٰ واقعہ نگاری کے ناظرین کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ چند اور نمونے اس عنوان کے تحت میں بھی لکھے جاتے ہیں۔

واقعہ نگاری حقائق تاریخی میں | شروع مثنوی میں ایک باب ہندوستان کی اسلامی فتوحات پر لکھا ہے سلطان معز الدین سام سے شروع کر کے جو ہندوستان کی نئی تاریخوں میں شہاب الدین غوری کے نام سے زیادہ تر مشہور ہے سلسلہ واقعات کو سلطان علاء الدین خلجی سے ملا دیا ہے اس سلسلہ میں رضیہ سلطانہ کی نسبت لکھے ہیں

ازاں پس چہں سپر کم بودشیاں	بدختر گشت رائے نیک رایاں
رضیہ دختر سے مرضیہ سیرت	سریر آ رہت از جئے سریرت
مے چند آفتابش بو در مرغ	چو برق از پردہ مینر و پر تو تیغ